© rasailojaraid.com


# دعوتِ اسلامی کے اساسی اصول و شرائط
## (ایک آیت کی روشنی میں)

از جناب نعیم صدیقی صاحب

اوائل ۱۹۷۶ء کی بات ہے کہ منصورہ سے حکم ملا کہ اپنے آپ کو اس غرض کے لیے تیار رکھو کہ شاید اسلامی دعوت کانفرنس میں جسے مدینہ یونیورسٹی سعودی عرب نے بلایا تھا تمہیں شریک ہونا پڑے۔ اس "شاید" کے سامنے یہ "باید" نمودار ہوا کہ ایک مضمون کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے تیار رکھنا چاہیے۔ چند دن کی سوچ بچار کے بعد مبحث کو مختصر رکھنے کے لیے ایک صورت نکالی۔ بہ عجلت مضمون لکھا اور اس کے انگریزی، عربی تراجم کرانے کے لیے تگ و دو شروع کی۔ کانفرنس کا وقت قریب آ جانے پر جب دیکھا کہ نہ دعوت نامہ، نہ ویزا، نہ ٹکٹ — تو سمجھ لیا کہ پیش نظر امکان باقی نہیں ہے۔ مگر مضمون بہر حال باقی رہا۔ سو وہ پیش خدمت ہے۔ اس کا تمہیدی و اختتامی حصہ غماز ہے کہ یہ مضمون کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے تھا۔

اکابر و اعاظم! اخوان و اعوان!

آپ سب پر سلام و رحمت میری طرف سے بھی، میرے دینی بزرگوں اور رفیقوں کی طرف سے بھی، اور پاکستان بھر کی ملتِ اسلامیہ کی طرف سے بھی!

**تمہیدی گذارشات** | نبیٔ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ کے ابتدائی سیزدہ سالہ دورِ دعوت و ابتلاء کو کامیابی سے گزار کر مدینہ میں اسلامی نظام کے عہدِ غلبہ و اقامت کا آغاز سلسلہ سے کیا تھا۔ تاریخ انسانی کا ایک نیا زریں عہد شروع کرنے کے لیے ہجرت نے جو زمانی خط کھینچا تھا، اس واقعہ کو جلد ہی چودہ صدیاں پوری ہونے والی ہیں۔ اس دوران میں مسلمانوں پر اقبال و ادبار، ترقی اور زوال، پیش قدمی اور پسپائی، کامیابی اور ناکامی، آزادی اور غلامی، امن اور جنگ، فلاکت اور خوش حالی کے مختلف ادوار آ کے گزرتے رہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اب جبکہ جلد ہی ہم چودھویں صدی ہجری کی منزل سے نکل کر ۱۵ ویں صدی ہجری کا آغاز کرنے والے ہیں، آثار و قرائن گواہی دیتے ہیں کہ یہ صدی انشاء اللہ غلبۂ اسلام اور صلاح و فلاحِ ملت کا ایک باب ہوگی۔

میرے اندر یہ امید دو شواہد سے پیدا ہوتی ہے :

اولاً یہ کہ مغرب کی ملحدانہ اور مادہ پرستانہ تہذیب جن نظریات و تحریکات کے ساتھ نمودار ہوئی تھی وہ خاصے لمبے دورِ تجربہ سے گذر کر ناکامی کی حد کو پہنچ رہے ہیں۔ علمی، فنی، تنظیمی، معاشی اور دماغی ترقیات کے باوجود انسانی زندگی کا بحران بڑھتا جا رہا ہے۔ اقوام اور طبقوں اور نسلوں اور مختلف علاقوں اور عالمی بلاکوں کے مابین تصادم اور فساد مختلف شکلوں میں نمایاں ہے۔ خواہشات نے آدمی کو سواری کا جانور بنا لیا ہے۔ وہ دولت کا خادم اور مشین کا غلام ہے۔ سیاست، معیشت اور معاشرت میں ایسی طاقتیں نفوذ کیے ہوئے ہیں کہ فرد ہر نظام میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ چاروں طرف خوف، حزن اور یاس کے سایے گھرے ہوتے جا رہے ہیں۔ جدید انسان کو اس کے خود پیدا کردہ جہنم سے نجات دلانے کے لیے اب کوئی قوت سوائے اسلام کے باقی نہیں ہے۔ پس یہ وقت ہے کہ اگر احیائے اسلام کی تحریکات کی تائید میں مسلم حکمران اور عوام دعوتِ اسلامی کا پرچم لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے عمل و کردار سے دینِ خدا و مصطفیٰؐ کی حقانیت کی گواہی دیں تو پھر بالفاظ اقبال یہ کہنے کا مقام آسکتا ہے کہ ؎

یہ صدائے دردمند سے، یہ نوائے دلپذیر سے
خمِ زندگی کشادم، بہ جہانِ تشنہ میرے

کاش کہ ہم کروڑوں پیاسوں کے جام ہائے تہی میں وہ مشروبِ کوثر انڈیل سکیں جسے یہ ضرورت مند زہر ہلاہل سمجھے بیٹھے ہیں۔

میری دوسری بنائے امید یہ ہے کہ تاریخ کے ہر گذشتہ دور میں احیائے اسلام کی جو بابرکت تحریکیں مسلمانوں میں اٹھتی رہی ہیں، ان کے نتیجے میں عملاً مکمل کامیاب انقلاب برپا نہ ہوسکنے کے باوجود بلکہ زیادہ تر بالکل کچلے جانے کے باوجود مغربی سامراج کے دورِ تاخت میں اسلام دشمن غاصب قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلم معاشروں میں سے بڑی جاندار شخصیتیں اور تنظیمیں اور تحریکیں نمودار ہوئی ہیں جنہوں نے مستقبل کے لیے اپنی قربانیوں کے قلوب و اذہان میں از سرِ نو حق کے بیج بو دیے ہیں۔ آخر میں جب ہم چودھویں صدی کی تحریکات کو دیکھتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تو یہ منظر سامنے آتا ہے کہ عالمِ اسلام کے ہر گوشے سے پے در پے ایسی تحریکات اُٹھی ہیں جن کا مقصد دعوتِ اسلامی کا فروغ، اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلامی انقلاب کو روبعمل لانا ہے۔ انڈونیشیا اور ملائشیا سے، ترکیہ اور مصر و سوڈان سے، پاکستان اور بنگلہ دیش سے اور خود سرزمین حجاز سے دعوتِ حق کے علمبردار اُٹھ رہے ہیں اور مصائب کا سامنا ہونے کے باوجود آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان تحریکوں کے مجموعی عمل سے امریکہ برطانیہ، یورپ، افریقہ اور جاپان میں بھی دعوتِ حق کی صدائے بازگشت سنی جاسکتی ہے۔

اس سلسلے میں مجھے بے حد مسرت ہے کہ رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے برکت یافتہ سرزمینِ حجاز میں دعوتِ اسلامی کے پرچم کو بلند تر کرنے کے لیے کام ہورہا ہے۔ شاہ فیصل کے ہاتھوں یہیں سے تحریک اتحاد اسلامی اُٹھی۔ یہاں مدینہ یونیورسٹی اور رابطہ عالم اسلامی جیسے ادارے قائم ہوئے۔ پھر بنکنگ بلاسود اور اسلامی نیوز ایجنسی اور اسلامی سیکرٹری ایٹ کی تاسیس کی گئی۔ اسی سرزمین پر اسلامی اقتصادیات کانفرنس، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کانفرنس، فقہ کانفرنس اور موجودہ دعوت اسلامی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ گذشتہ سال لندن کی عظیم الشان اسلامی کانفرنس کے انعقاد میں بھی کارپردازانِ نجد و حجاز کا بڑا حصہ ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ مختلف مسلم حکومتوں کے سربراہ اور زعماء دین اگر نوجوان قوموں کے ساتھ مل جل کر اسلام کے فروغ کے لیے کام کریں تو منزلِ مطلوب جلد سر ہوسکتی ہے۔

غیر اسلامی دنیا، اور اسلامی دنیا کی مذکورہ علامات کو سامنے رکھ کر میں اللہ سے یہ اُمید کرتا ہوں کہ پندرھویں صدی ہجری ہماری نشاۃِ نو کی صدی ہوگی۔ (انشاء اللہ)

ان تمہیدی گذارشات کے بعد میں اپنے تجویز کردہ عنوان کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

**اسلام میں دعوت کی اہمیت**

ایمان باللہ اور اطاعت اللہ کے ساتھ دعوت الی اللہ کو لازم کیا گیا ہے۔ دعوت الی اللہ کا ہدف بالفاظ حضرت مُغیرہ بن شعبہ "اِخْرَاجُ العِبَادِ مِنْ عِبَادَةِ العِبَادِ اِلٰی عِبَادَةِ اللّٰہ" ہے[1] یعنی بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں لانا۔ اس کا تکمیلی نتیجہ اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ تمام انبیائے کرام (علیہم السلام) ایک ہی دعوت کے علمبردار تھے جیسے کہ قرآن صراحت کرتا ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (النحل ۳۶) فرمایا کہ ہم نے

[1] البدایہ والنہایہ۔ ج ۷، ص ۳۹۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول اسی دعوت کے ساتھ بھیجا کہ (لوگو) اللہ کی عبادت کرو۔ حضورؐ داعیاً الی اللہ (الاحزاب ۴۶) بن کر اٹھے تو مسلمانوں کو وحی الٰہی کے مطابق امتِ وسط قرار دے کر شہادۃ علی الناس کا فریضہ سونپا گیا (البقرہ: ۱۴۳) مقصدِ دعوت (جس کی تکمیلی منزل جہاد بھی ہے) کے لیے ان کو پکارا: کونوا انصار اللہ (الصف: ۱۴) کہ اٹھو اور اللہ کے کام میں مددگار بنو۔ کہیں بات دوسرے الفاظ میں کہی: تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر) ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرو، اور (اس راہ میں جو کچھ پیش آئے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے) آپس میں صبر کی تلقین کرو۔ (سورۂ عصر: ۳)۔ ایک اصطلاح اور بھی قرآن میں استعمال ہوئی ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۰۴) ضرورت ایک ایسی امت کی بتائی گئی جو بھلائی کی دعوت دے، نیکی (کو پھیلانے) کے لیے حکم کرے، اور برائی سے روکے۔ تلقین حق، یا بھلائی کی دعوت اور نیکی کا حکم اور بدی کا انسداد اسی کارِ عظیم کی تعبیر و تفصیل ہے جسے ہم دعوت اسلامی کے عنوان سے لے رہے ہیں۔

ایک حدیث میں حضورؐ نے بنی اسرائیل کی خرابیٔ احوال کا ذکر کر کے نہایت شدت سے کارِ دعوت کی تاکید فرمائی:۔

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذُنَّ عَلٰی یَدِیِ الظَّالِمِ وَلَتَأْطُرُنَّهٗ عَلَی الْحَقِّ اَطْرًا اَوْ لَیَضْرِبَنَّ اللّٰہُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰی بَعْضٍ ثُمَّ لَیَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ۔

(روایت ابن مسعودؓ مندرج بیہقی و مشکوٰۃ)

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہوگا اور برائیوں سے (لوگوں کو) روکنا ہوگا، اور تمہیں ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے حق کے سامنے جھکانا ہوگا ورنہ تم سب کے دل بھی ایک ہی طرح کے ہو جائیں گے[1] (یعنی برائی کا رنگ سب پر چڑھ جائے گا)۔ پھر اللہ تعالیٰ تم کو بھی اسی طرح اپنی رحمت و مغفرت سے دور کر دے گا جیسے اس نے انہیں (بنی اسرائیل کو) کیا تھا۔

۱؎ یہ مفہوم بھی غالباً ہو سکتا ہے کہ تمہارے قلوب آپس میں ٹکرا کر پھوٹ میں پڑ جائیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں اس بحث کو اُٹھانے کا موقع نہیں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہدف مقصود یہ ہے کہ اہل حق کو اتنی قوت حاصل ہو جائے کہ وہ ظالم کے دستِ ظلم کو روک سکیں اور اُسے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیں۔ البتہ یہ امر واضح ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی عدم ادائیگی خدا کی رحمت سے محرومی کا باعث ہو سکتی ہے۔ یعنی دعوت الی اللہ، اور دعوت برائے اعلائے کلمۃ اللہ ذریعہ حصولِ رحمت ہے۔

بس کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو سکتا جو دعوتِ اسلامی میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق حصہ لیے بغیر خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے کا حق ادا کر سکے، اور جس پر ہمہ وقتی ڈیوٹی عاید نہ ہو۔

**سورہ النحل کی آخری آیات**

دعوتِ اسلامی وہ فریضۂ محکمہ اور سنتِ قائمہ ہے جس کے لیے قرآن میں کئی مقامات پر ہدایات دی گئی ہیں۔ مگر ایک مقام ایسا ملے گا کہ جہاں دعوتِ اسلامی کے اساسی اصول و شرائط مختصراً یکجا ملتے ہیں۔ قرآن کے اس مقام کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت ہرم ابنِ حیان پر جب آخری وقت آیا تو لوگوں نے وصیت کے لیے تقاضا کیا۔ حضرت ہرم نے جواب دیا کہ میرے پاس مال و جائداد تو ہے نہیں کہ اس کے بارے میں وصیت کر دوں، میری وصیت ہے تو بس یہ کہ سورۃ النحل کی آخری آیات کی پاسداری کی جائے۔ چنانچہ میری نگاہ قرآن کے اس مقام پر مرتکز ہوئی۔ یہ آیات چار ہیں (۱۲۵ تا ۱۲۸)۔ ان میں دعوتِ اسلامی کے اساسی اصول و شرائط مذکور ہیں ان کو میں الگ الگ عرض کرتا ہوں۔

**اسلام اور توسیعِ دعوت**

سب سے پہلے اُدْعُ کا امر ہمارے سامنے آتا ہے، مگر اس پر بات کرنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ دنیا میں بعض مذہبی نظام ایسے ہیں کہ جن کی فطرت تبلیغی نہیں ہے۔ کچھ تحریف زدہ مذہبی اجزا، کچھ غیر عقلی عقیدے اور کچھ خاص طرح کے اخلاقی تصورات ایک نسلی عصبیت کی فصیل سے گھر جاتے ہیں۔ ایسے مذاہب کا چلن زیادہ تر ان کو اختیار کرنے والے گروہ کی اگلی نسل میں، اور پھر اس سے اگلی نسل میں ہوتا رہا ہے۔ بسا اوقات تو نسلی نسبت کی طرح ایک مذہبی نسبت باقی رہ جاتی ہے۔ جو تھوڑے سے بہت حقیقت کے اجزا مذہب میں شامل ہوتے ہیں وہ بھی پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ نسلیت کی فصیل کے اندر نسلی مذہب کی کتنی ہی متفرق و متضاد تعبیریں پیدا ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ انکارِ خدا، اور نفی اعتقادات اور ترکِ اخلاق تک بھی نوبت پہنچتی ہے، اور بالعموم عملی زندگیوں کی نشوونما آزادانہ صورت میں ہوتی ہے۔ لیکن جو فصیل کے اندر ہے اور اندر پیدا ہوا وہ بہر حال اپنی مخصوص نسل کی طرح اپنے مخصوص مذہب سے وابستہ سمجھا جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

دراصل ایک مضبوط معاشرتی وحدت ایسی پیدا ہو جاتی ہے جس کے جال سے کوئی نکل نہیں سکتا۔ ایسے مذاہب میں نہ انسانیت کے لیے اپیل ہوتی ہے اور نہ دعوت کے فروغ کا اہتمام ہوتا ہے۔ بلکہ فصیل سے باہر کے لوگوں کو پیدائشی طور پر ناپاک اور پست اور ذلیل سمجھا جاتا ہے اور ان سے نفرت کی جاتی ہے۔ اگر کسی زور آور قوت سے سابقہ پڑے تو خوشامد کے پردے میں اس کے خلاف سازش کی جائے گی اور اگر کوئی کمزور زد میں آئے تو اول تو اسے ظلم اور تشدد کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا جائے گا، ورنہ اُسے معاشرے کی سب سے نچلی سطح پر رکھ کر مظلومی اور محرومی کی مختلف شکلوں سے دوچار کیا جائے گا۔ اس کی مثال میں یہود اور ہنود کے مذاہب کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اسلام سچا، الہامی اور عقلی دین ہے اور پوری زندگی کے لیے صلاح و فلاح کا پیغام ہے۔ لہٰذا وہ ساری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے۔ یہ کسی خاص نسل یا وطن کے لیے خاص نہیں ہے اور نہ نسلیت اور وطنیت کے ساتھ گندھا ہوا ہے۔

اُدۡعُ میں توسیعِ دعوت کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظام تمام انسانوں سے محبت کرنے والا اور تمام انسانوں کی خیر خواہی کا علمبردار ہے۔ اسے نسل و وطن اور مروجہ مذاہب اور معاشرتی نظاموں کی وجہ سے کسی سے ایسی نفرت نہیں ہے کہ وہ انہیں دعوت کا مخاطب نہ بنائے اور دعوت قبول کرنے پر اپنی محفل کے شرکاء کے ساتھ برابر کی جگہ نہ دے۔ یہ کلمہ اُدۡعُ ان تمام مصنوعی تقسیموں کی نفی اپنے اندر مضمر رکھتا ہے جن کی کھڑی کی ہوئی دیواروں میں انسانیت تقسیم ہو گئی ہے اور اس تقسیم سے پیدا ہونے والے تمام گروہ ایک دوسرے کے معاند ہیں۔

حکمِ اُدۡعُ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ خدا کا دین ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک فرد اس پر ایمان لا کر، اور اپنی ذات کی حد تک چند عقیدے اور چند عبادات اور چند اخلاقیات کو اختیار کر کے یہ سمجھ لے کہ اس کا کام پورا ہو گیا ہے اور دوسروں کے متعلق اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، جیسا کہ سورۃ المائدہ کی آیت (۱۰۵) "عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ" سے نزولِ آیت کے وقت بعض صحابہ کو وقتی طور پر غلط فہمی ہوئی تھی۔ کوئی مسلمان یوں نہیں سوچ سکتا کہ اس کا خاندان، اس کا معاشرہ، اس کا ملک اور ملک کا نظام فرمانروائی، اور چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا جس بگاڑ میں چاہے مبتلا ہوتی رہے، اس کی بلا سے، اس کے وجود کے ارد گرد جس بھی عقیدہ و مسلک کے لوگ نظامِ ریاست و معیشت، نظامِ معاشرت و تمدن، نظامِ اخلاق و افکار اور

© rasailojaraid.com



نظامِ تعلیم و ثقافت کو جیسی بھی شکل میں چاہیں چلاتے رہیں، وہ بری الذمہ ہے۔ نہیں بلکہ مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ دوسروں تک دعوت پہنچائے، ان کے قلوب و اذہان اور عادات و اطوار کو تبدیل کرنے کی کوشش کرے۔ یہاں تک کہ کوئی طاغوتی نظام اور اُس کی فاسد قیادت برقرار نہ رہ سکے۔

اُدْعُ کا اشارہ یہ بھی ہے کہ خدا کا دین سمٹ کر رہنے کے لیے نہیں، پھیلنے کے لیے آیا ہے۔ افراد کی نجی زندگیوں میں دبکا رہنے کے لیے نہیں، بلکہ ہیئت اجتماعیہ پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے آیا ہے۔ وہ انفرادی مذہب نہیں، اجتماعی دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے اپنے پیروؤں پر دعوت کی ذمہ داری پوری اہمیت سے ڈالی ہے۔ اسلامی دعوت بعض دوسرے مذاہب کے پرچار اور پرچنگ کی طرح ایک محدود اور سرسری مشغلہ نہیں ہے[1]۔

پیشِ نظر رہے کہ انسانی تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ دنیا میں صرف وہی عقیدے، مسلک اور نظام غالب ہوئے یا کم از کم کسی شکل یا درجے میں باقی ہی رہ سکے، جن کے ماننے والوں نے دوسروں تک دعوت پھیلائی۔ کسی عقیدہ و مسلک کو انسان خود اپنے اندر بھی تسلسلِ دعوت کے بغیر برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اسلام نے بھی اگر فروغ حاصل کیا اور غالب ہوا تو یہ نتیجہ تھا دعوتِ اسلامی کی راہ میں اُس مجاہدۂ عظیم کا جس کا حق اوّلاً رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کبار نے، اور بعد کے ائمہ ہدیٰ اور دعاۃِ حق اور ان کے قائم کردہ اداروں اور تنظیموں نے زبان و قلم کی حرکت اور جان و مال کی قربانیوں سے ادا کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم مسلمان ایک بڑی تعداد میں چودہ صدیوں سے کرۂ ارض پر موجود ہیں۔ آج ہماری کمزوری کا سبب یہ ہے کہ ہم نے بحیثیتِ امت مجتمعاً شہادت علی الناس کا فریضہ کما حقہٗ ادا نہیں کیا، بلکہ محض کچھ عزیمت مند افراد اور چھوٹے چھوٹے ادارے دعوت کا تسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے اس محدود کارِ دعوت کو بھی

---

[1] اس کے لیے بدیہی حکم دینے کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث میں اس کے لیے مؤثر حکیمانہ طریقِ کار کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ دعوت دینے والوں کے لیے ایک اخلاقی معیار مقرر کیا گیا ہے اور دعوت سے لوگوں کے قلوب کے مفتوح ہونے نہ ہونے کی دونوں صورتوں کے لیے داعیان کا موقف متعین کیا گیا ہے، یعنی اسلام میں دعوت کا ایک مستقل ضابطہ اور لائحہ عمل ہے، جس طرح دوسرے دینی مقاصد کے لیے تفصیلی نقشے دیے گئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہماری عملی زندگیوں کا تضاد پنپنے نہیں دیتا۔ آج کا باطل کا جہاں گیر سیلاب اتنا تند و تیز ہے کہ اچھے اچھے پرجوش خادمانِ اسلام کے لیے اپنے ایمان اور اپنی اخلاقی قدروں کو بچانا مشکل ہو رہا ہے۔ اور اگر کچھ لوگ اپنا بچاؤ کسی قدر کر بھی لیں تو اُن کی خواتینِ خانہ اور ان کی اولادوں کو مادہ پرستی کے عفریت ان کی آنکھوں کے سامنے ہڑپ کرنے جا رہے ہیں۔ اس طوفانِ دوراں میں صرف دعوتِ اسلامی ہی کشتئ نوح بن کر ہمیں تباہی سے بچا سکتی ہے۔

اُدْعُ کی تعمیل تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ داعی ایک طرف تو یہ جانتا ہو کہ وہ کس مسلک اور نظام کی دعوت دے رہا ہے، دوسری طرف یہ بھی اس پر واضح ہو کہ اس کے اختیار کردہ حق کے بالمقابل باطل کن کن شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ دعوت تو وہ جبھی دے گا اور جبھی وہ مؤثر ہو گی جبکہ اسلامی اصول و مقاصد پر اس کا دل ٹھک جائے اور وہ اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھال رہا ہو۔ دوسرے پہلو سے غیر اسلامی نظریات و تحریکات کے باطل ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں اُن سے اجتناب کرنے اور اُن کے اثرات کی مزاحمت کرنے کا جذبہ موجود ہو۔ اسلامی دعوت کی راہ میں ایسے مسلمان کوئی مؤثر حصہ ادا نہیں کر سکتے جو نہ حق کا حق ہونا سمجھتے اور اپنی زندگیوں کو اس کے حوالے کرتے ہوں، اور نہ باطل کو باطل مان کر اس سے اپنے افکار و کردار کو محفوظ رکھنا چاہتے ہوں۔ غفلت زدہ قلوب، دھندلے تصورات، تذبذب و تامل کی کیفیات اور عملی تضادات کے ساتھ اسلامی دعوت کا فریضہ انجام دینا ممکن نہیں۔

یہاں تو عالم یہ ہو گیا ہے کہ مسلم معاشروں میں سے جو لوگ دعوت اسلامی کی علمبرداری کے لیے اُٹھتے ہیں، اُن کے لیے مشکلات پیدا کرنے، انہیں اُلجھانے، انہیں پریشان کرنے بلکہ تشدد و تعذیب کا نشانہ بنانے کے لیے خود وابستگانِ اسلام ہی میدان میں آتے ہیں۔ ایسے وابستگانِ اسلام نے کتنی ہی اسلامی تحریکوں اور تنظیموں کو کچلا۔ کتنے ہی صلحا کی جانیں لیں، کتنوں کو قید و بند میں ڈالا اور کتنوں کو معاشی مصائب کے حوالے کر دیا۔

یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ ان سنگین اور نامعقول حالات کے باوجود اسلامی دعوت نے خود مسلم معاشروں میں بھی اور غیر مسلم دنیا میں بھی پیش قدمی کی ہے۔ اور روز بروز دعوتِ اسلامی کی لہر اونچی اُٹھ رہی ہے۔

**سبیلِ ربّ کی دعوت**

اُدْعُ کے ساتھ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ کے الفاظ دعوت کا رُخ اور ہدف متعین کرتے ہیں۔ ”سبیل“ کا لفظ حرکت و اقدام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کچھ خطوط ہیں جن پر عملاً آگے بڑھنے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دعوت دی جاتی ہے۔ یہ لفظ جامد مذہبیت کی نفی کرتا ہے۔ دعوت کا مقصود جادۂ ہدایت کو سامنے لانا ہے جس پر افراد اور اقوام کے قافلے زندگی کا سفر سلامتی سے طے کرسکیں۔

اِلیٰ سبیل ربّک کا منشا یہ بھی ہے کہ دعوت سبیلِ رب کی طرف دی جائے گی۔ اپنی کسی من گھڑت بات یا ایجاد کردہ یا مستعار لیے ہوئے پروگرام کی طرف نہیں۔ ربِّ واحد کو چھوڑ کر، یا اس کے ساتھ کسی خاص شخص یا قوم یا خاندان یا نسل کی دعوت دینا مطلوب نہیں ہے۔ نہ کسی طبقے یا فرقے کو مقصود بنایا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ سبیل رب کے ساتھ فاسد تاویلات، من گھڑت بدعات اور رسوم و قیود کی جو آلائشیں جمع ہوگئی ہوں، داعی انھیں الگ کرکے، اصل دین کو نکھار اور نکھار کر پیش کرے۔ ہماری پچھلی تاریخ میں خاندانوں کی نزاعات، اقتدار کی رسّہ کشی، مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑا دینے اور ملت کو پھاڑ دینے والے جو اختلافات اور طبقوں اور نسلوں کے درمیان جو سازشیں نمودار ہوتی رہی ہیں ان سب کے زیر اثر دین کے تصورات مسخ ہوئے ہیں اور ایک شاخ در شاخ تفرقہ نمودار ہوا ہے۔ اسی طرح ایک دَور میں عجمی ثقافت و تمدن اور اس کے ساتھ ہندی تصوف و تفلسف، پھر ایک دَور میں یونان کے الٰہیاتی اور سیاسی فلسفہ و منطق، اسی طرح ایک دَور میں تفسیری لٹریچر میں اسرائیلیات، اور اب بعد کے دَور میں مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب کے نظریات و علوم ہمارے دینی تصورات میں اس طرح سرایت کرتے رہے جس طرح زہر زخم میں پھیلتا ہے۔ گذشتہ اور موجودہ دَور کے ان بیرونی اثرات سے جو چیزیں دین اور دینی فکر میں داخل ہوتی ہیں ان کو الگ کرنا آج کے سچے داعیٔ اسلام کے لیے ضروری ہے۔

سبیلِ ربّ کے لیے دعوت کو مخصوص کرنے کا یہ تقاضا بھی واضح ہے کہ داعیانِ حق کو ہر قسم کی جاہلی عصبیتوں اور نسل کی بنا پر کھڑی ہونے والی جانب داریوں اور تفرقوں سے بھی نجات حاصل کرنی چاہیے۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں کتنی سخت بات فرمائی کہ لَیْسَ مِنَّا مَنْ دَعیٰ اِلیٰ عَصَبِیَّۃٍ ..... الخ (روایت حضرت جبیر بن مطعم۔ مندرجہ ابی داوٗد) ترجمہ: وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جس نے کسی عصبیت کی دعوت دی.....!

**شرطِ حکمت** خدا کے راستے کی طرف دعوت دینے کا ایک تقاضا یہ ہے کہ اسے (بالحکمۃ) حکمت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ مقصود یہ ہے کہ دعوتِ حق کو اندھے کی لاٹھی کی طرح نہ گھمایا جائے بلکہ بصیرت مندی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کام لیا جائے۔ مخاطبین کے ظروف و احوال، ان کے مسائل، ان کے ذہنی اشکالات، ان کی نفسیاتی کیفیات، ان کے جاذبِ توجہ معاملات اور دعوتِ حق کو سننے کی آمادگی اور قبول کے رجحانات کا اندازہ کر کے موقع کے لحاظ سے دیکھا جائے کہ کتنی بات کس انداز سے کہنا مناسب ہے۔ جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

إِنَّ لِلْقُلُوْبِ شَهَوَاتًا وَإِقْبَالًا وَإِدْبَارًا فَأْتُوْهَا مِنْ قِبَلِ شَهَوَاتِهَا۔

انسانی قلوب کچھ خواہشات رکھتے ہیں، اور (ان کی وجہ سے) ان میں کبھی آگے بڑھنے کا میلان ہوتا ہے اور کبھی پیچھے ہٹنے کا۔ پس ان کی خواہشوں (اور جذباتی کیفیات) کو نگاہ میں رکھ کر ان پر اثر انداز ہونے کا راستہ نکالو۔

(کتاب الخراج - ابو یوسف)

پھر مخاطبین کی بڑی اقسام ہیں۔ مختلف زمانوں، ملکوں، نسلوں اور طبقوں کے لوگ الگ الگ احوال رکھتے ہیں۔ ان میں مستکبرین بھی ہوتے ہیں اور مستضعفین بھی، مترفین بھی ہوتے ہیں اور مساکین بھی، متلاشیانِ حق بھی ہوتے ہیں اور دنیا پرست غافلین بھی، ان میں سنجیدہ شرفاء بھی ہوتے ہیں اور معاندین اور مستہزئین بھی۔ پھر لوگوں میں وہ بھی ہوتے ہیں جو یکسر تارکین مذہب اور الحاد پسند و اباحیت پسند ہوتے ہیں، وہ بھی جو کسی محرف مذہب کے چند ٹوٹے پھوٹے اجزاء کو سینے سے لگائے ہوئے ہوتے ہیں، اور وہ بھی جو اسلام جیسے دین سے نسبت رکھنے کے باوجود نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ عمل، بلکہ اُلٹا بعض جرائم پیشہ ہوتے ہیں، بعض مسلمان ہوتے ہوئے اسلامیت کے خلاف جنگ آزما رہتے ہیں، بعض تفریح بازی کے مشغلوں میں لگے رہتے ہیں۔ بعض مذہبی لوگ اسلام اور غیر اسلام کے اجزاء کو خلط ملط کر کے اپنے کردار میں جمع اضداد کرتے ہیں۔ وہ بھی ہوتے ہیں جو غیر اسلامی مشاغل حیات پر اسلام کا لیبل چسپاں کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ دنیا میں بھی مزے کر رہے، اور جنتِ اُخروی بھی پیشگی الاٹ شدہ ہے۔ غرض کئی طرح کے مریضانِ ضلالت ہیں جن کے لیے طریقِ دعوت کا نسخہ الگ الگ بنانا پڑتا ہے۔

ان مختلف اقسام کے لوگوں سے دنیا بھر میں جو معاشرے تشکیل پاتے ہیں۔ وہ الگ الگ قسم کے تاریخی احوال، سیاسی مدوجزر، اقتصادی عدم توازن اور معاشرتی فساد سے گزر رہے ہوتے ہیں۔

اصولِ حکمت کے تحت داعیِ حق کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ وقت کے مجموعی احوال کی نبضوں پر انگلیاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


نہ ہٹائے اور مختلف گروہوں اور طبقوں کی دلچسپیوں اور توجہات کو سمجھے، اور پھر ہر مخاطب فرد کی نفسیاتی و اخلاقی کیفیت کی تشخیص کرے۔ پھر یہ طے کرے کہ کسی گروہ یا مجلس کو مجتمعاً یا کسی فرد کو منفرداً دعوت پہنچانے کا پروگرام کیا ہوگا، اس کی ترتیب کیا ہوگی اور اس کا اسلوب کیا ہوگا۔ نیز وہ عناصر کونسے ہیں جن کو ایک مرحلے پر نظر انداز کر دینا ضروری ہے۔

قرآن کی رُو سے تو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزیں دو ہیں: ایک ہدایت (اصولی حقائق کی تعلیمات اور ضابطہ) اور دوسری حکمت جس کے لیے میزان کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ قرآنی تعلیم یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں جس طرح ضابطے کے نفاذ میں حکمت کا التزام ضروری ہے، اسی طرح دعوت کی توسیع کی مہم میں بھی حکمت سے کام لینا لازم ہے۔ چنانچہ خود قرآن نے مستکبرین، مستضعفین، منکرین، غافلین اور متلاشیانِ حق اور طلبگارانِ حق اور اہلِ نفاق کے نفسیاتی اور عملی خاکے پیش کر کے ہر ایک کے متعلق رہنمائی دی ہے کہ کب کس سے کیا معاملہ کرنا چاہیے۔ پھر احادیث کا خزینۂ ہدایت قرآنی احکام و اشارات کے عملی انطباق کے جو وسیع نمونے ہمارے سامنے رکھتا ہے، وہ اپنی جگہ بے حد حکمت آموز ہیں۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ صحیح داعیٔ حق وہ ہے جس کی بصیرت اُسے رہنمائی دیتی رہے کہ کہاں صراحت مناسب ہے اور کہاں کنایت سے آغاز کرنا ہے، کہاں تفصیل میں جانا ہے اور کہاں اجمال پہ اکتفا کرنا ہے، کہاں بات براہِ راست کہی جائے اور کہاں پیغام در حدیث دیگراں سُنایا جائے، کہاں ترغیب ہو اور کہاں ترہیب، کہاں تبشیر ہو اور کہاں اِنذار، کہاں علمی مباحث چھیڑے جائیں اور کہاں سادہ سہل گفتگو سے کام لیا جائے، کس وقت کتنی بات کی جائے اور آئندہ کتنے کتنے وقفوں سے دعوت دی جائے۔

**حکمت کا غلط تصور** حکمت کا مفہوم ہمارے ہاں انگریزی لفظ پالیسی کی طرح قدرے بگڑا ہوا ہے۔ اس وجہ سے یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ عوام کے سامنے دین کو من گھڑت، بے سند اور محیر العقول قصوں سے آراستہ کر کے، اُن کی پسند کے غیر اخلاقی طرزِ کلام سے کام لے کر، لچھے دار تقریروں کے نقرے گنگنا کر اور جلسوں کو سامانِ تفریح بنا کر انہیں بہلا یا پھسلایا جائے۔ کہیں منت سماجت، لجاجت اور خوشامد سے اور کہیں کثیر التعداد حامیوں کی دھوم دھام کا رُعب بٹھا کر اور کہیں مناظروں کے اکھاڑے جما کر خدا کے مقدس دین کی طرف لوگوں کو مائل کیا جائے۔

حکمت لوگوں کو بہکانے ورغلانے کا نام نہیں ہے، اور نہ خدا کے دین کا یہ مقصد ہے کہ لوگ صُمًّا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَّ بُکْمًا وَّ عُمْیَانًا ہوتے ہوئے دین کی عقیدت کے مظاہرے کریں۔ وہاں تو مطلوب ایمانی شعور کا پیدا کرنا ہے — پڑھے لکھوں میں علمی سطح کا شعور، اور غیر تعلیم یافتہ عوام میں سادہ قسم کا شعورِ حقائق۔ دینی حقائق کا شعور پھیلائے اور خیالات اور اخلاق کی اصلاح کیے بغیر ووٹ تو لیے بھی جا سکتے ہیں، مگر لوگوں سے دین کے مطالبات پورے نہیں کرائے جا سکتے۔

نیز دعوتِ حق کا کام جس اخلاص سے ہوتا ہے وہ کسی تصنع کو گوارا نہیں کرتا کہ داعی بہروپ بھرے اور ایکٹنگ کرے اور لوگوں کو گم سُم کر دے۔ دعوتِ حق کا وقار اور داعی کے اخلاص کے شایانِ شان تو یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ وہ مصنوعی موادِ کلام تو کجا مصنوعی اندازِ کلام بھی اختیار کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سخت الفاظ میں گفتگو اور تقریر کے بعض اسالیب سے منع کیا ہے۔ مثلاً فرمایا: هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ غارت ہوئے غلو اور مبالغہ کرنے والے (روایت ابن مسعودؓ - ابو داؤد) پھر فرمایا کہ تم میں سے قیامت کے دن مجھ سے بعید ترین اور میری نگاہ میں مبغوض ترین ثرثارون، المتشدقون اور المتفیہقون ہوں گے۔ (روایت حضرت جابر - الترمذی) ان الفاظ سے مراد مختلف اقسام کے وہ لوگ ہیں جو تکلفاً بسیار گوئی کریں، مصنوعی طور پر کلام کو پُرشکوہ بنائیں اور لغتِ غریب اور اصطلاحاتِ نامانوس سے سامعین کو مبہوت کریں، تکبر و تفاخر کے جذبے اور اپنے فرمودات کے بلند پایہ ہونے کے زعم کے ساتھ رُعب گانٹھیں۔ (باقی)

© rasailojaraid.com